معینہ کوثر سیٹھی☆/ڈاکٹر محمد سعید☆☆/ڈاکٹر محمد عابد علی☆☆☆

علامہ اقبال کی تعلیمی اصلاحات، روایاتی اور جدید تعلیمی نظام کا تجزیہ

Educational Reforms of Allama Muhammad Iqbal

(An Analysis of Traditional and Modern Educational system)

Abstract

This study critically analyzes the educational philosophy of Allama Muhammad Iqbal, focusing on his critique and reformation proposals for both traditional religious and modern education systems. Allama Iqbal highlighted the shortcomings of the old religious education system, such as rigidity, narrow-mindedness, sectarianism, and intellectual stagnation, while also addressing the negative impacts of modern education, including the promotion of materialism, moral decay, and detachment from religious and cultural values. He emphasized the need for a balanced educational approach integrating spiritual and moral development with contemporary knowledge. Iqbal criticized modern education for fostering atheism, unemployment, and societal unrest, particularly its adverse effects on women's roles and family structures. He also expressed dissatisfaction with contemporary educators, who, in his view, lacked moral integrity and a clear educational vision. Ultimately, Iqbal advocated for an educational system that preserves Islamic identity,

☆ کوآرڈینیٹر، اقبال چیئر و لیکچرر، شعبہ انسانیات و سماجی علوم، بحریہ یونیورسٹی اسلام آباد

☆☆ لیکچرر شعبہ اسلامیات، HITEC یونیورسٹی ٹیکسلا کینٹ

☆☆☆ ماہر تعلیم، پی ایچ ڈی، بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی ملائیشیا

fosters critical thinking, and addresses the needs of the modern era while avoiding intellectual chaos and moral degradation.

Keywords: Allama Iqbal, educational philosophy, traditional education, modern education, moral decay, Islamic identity, educational reform.

افراد و ملل کی زندگی میں تعلیم و تربیت کا انتہائی اہم کردار ہے، اور ہر قوم کی پہچان اپنے نصب العین، مقصد حیات، تہذیب و تمدن اور اخلاق و معاشرت سے ہوتی ہے، اور یہ تمام چیزیں اسی تعلیمی فلسفے کی پیداوار ہوتی ہیں۔ اسی وجہ سے علامہ محمد اقبالؒ نے بھی اپنی قوم کی اسی سلسلے میں رہنمائی فرمائی ہے۔ خواہ تمام ماہرینِ تعلیم فلسفی نہ ہوں، ایک بات واضح ہے کہ تمام فلسفی، براہِ راست یا بالواسطہ، ماہرِ تعلیم ضرور تھے۔[1]

کسی بھی قومی نظامِ تعلیم کی تشکیل اور ترقی کے لیے ایک واضح تعلیمی فلسفہ ناگزیر ہوتا ہے۔ یہ فلسفہ دراصل وہ تصوری خاکہ فراہم کرتا ہے جس پر نصاب، تدریسی حکمتِ عملیاں، اور تعلیمی مقاصد استوار کیے جاتے ہیں۔ تعلیم کے وہ مقاصد جو کوئی قوم اپنے لیے طے کرتی ہے، اس کی زندگی کے فلسفے میں گہرائی سے جڑے ہوتے ہیں اور بآسانی تبدیل نہیں کیے جاسکتے۔ کوئی قوم اُس وقت مر جاتی ہے جب وہ اپنے نظریات کھو بیٹھتی ہے۔ اس نکتہ پر مولانا ابوالاعلیٰ مودودی بھی توجہ دلاتے ہیں کہ نظریاتی ریاستیں اپنے نوجوانوں کو اجنبی فلسفوں کے رحم و کرم پر نہیں چھوڑ سکتیں، کیونکہ اس سے نہ صرف ان کی فکری ساخت متاثر ہوتی ہے بلکہ قوم کی نظریاتی شناخت بھی زائل ہو جاتی ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ اگر تعلیمی نظام کو قومی نظریے سے کاٹ دیا جائے تو طالب علموں کی سوچ، اقدار اور شعور لاشعوری طور پر بیگانہ نظریات سے متاثر ہو جاتا ہے۔[2] مزید یہ کہ کوئی بھی نظریاتی ریاست اس وقت تک قائم نہیں رہ سکتی جب تک کہ اس کے منتظمین اور نظام تعلیم کی بنیادیں اپنے فلسفۂ حیات پر قائم نہ ہوں۔ اسی سلسلے میں سید قطب مغرب سے تعلیمی ماڈلز کو بلا تنقید اپنانے پر تنقید کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ تعلیمی طریقۂ کار، تدریسی ٹیکنالوجی اور نصاب کبھی بھی قدر سے خالی یا غیر جانبدار نہیں ہوتے۔ وہ واضح کرتے ہیں کہ:"جب ہم مغربی تعلیمی طریقے، تربیتی نظام اور نصابِ تعلیم کو اپناتے ہیں تو ہم ان کے ساتھ وہ فکری سانچہ اور نظریاتی ڈھانچہ بھی قبول کر لیتے ہیں جو ان کے پیچھے کار فرما ہوتا ہے، چاہے ہمیں اس کا شعور ہو یا نہ ہو"۔[3]

ان خیالات کی روشنی میں علامہ محمد اقبال کا تنقیدی نقطۂ نظر نہایت اہمیت کا حامل ہے۔ اقبال اس مغالطے کو رد کرتے ہیں کہ سائنس اور ٹیکنالوجی میں ترقی مغربی فلسفوں یا زبانوں سے مشروط ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ یہ ایک نو آبادیاتی فریب ہے کہ ترقی صرف مغربی فکر کے ذریعے ممکن ہے۔ وہ یاد دلاتے ہیں کہ یورپ کا نشاۃ الثانیہ (Renaissance) اسلامی زبان یا فلسفہ کو اپنائے بغیر رونما ہوا؛ انہوں نے اپنی فکری روایت کو تخلیقی انداز میں زندہ کیا۔ اسی طرح، مسلمانوں کو چاہیے کہ وہ توحید، خودی اور اجتہاد پر مبنی اپنے فکری ورثے سے رہنمائی لیتے ہوئے ایک ایسا نظامِ تعلیم تشکیل دیں جو دینی اساس کے ساتھ جدید تقاضوں سے ہم آہنگ ہو۔ اقبال بطور شاعرِ مشرق اور مفکر، مسلم معاشروں میں تعلیمی بحران پر گہری تشویش رکھتے تھے۔ ان کا ماننا تھا کہ موروثی روایتی نظامِ تعلیم اور نو آبادیاتی دور میں متعارف کرایا گیا مغربی ماڈل، دونوں ہی اس انسان کی تعمیر کے لیے ناکافی ہیں جس کا تصور اسلام پیش کرتا ہے۔ اقبال کے نزدیک تعلیم محض معلومات کی منتقلی نہیں بلکہ انسانی صلاحیتوں کی ہمہ جہت تربیت کا نام ہے، جو خودی کی بیداری اور خدائی مقصد سے ہم آہنگی کے ذریعے حاصل ہوتی ہے۔ [4]

علامہ کا تعلیمی نظریہ مسلمانوں کو ایک زندہ اور جاندار قوم بنا سکتا ہے۔ چوں کہ علامہ کے زمانے میں ہندوستان میں اہل اسلام کا واسطہ دو قسم کے نظام ہائے تعلیم سے تھا، ایک نظام تعلیم قدیم دینی مدارس کا تھا جہاں صرف روایتی دینی تعلیم دی جاتی تھی، اور دوسرا انگریزوں کا لایا ہوا نظام تعلیم تھا، جس کا مقصد صرف حصول معاش تھا۔ علامہ کو دونوں نظام ہائے تعلیم سے خوب واقفیت تھی اور دونوں کی کمزوریوں اور خامیوں سے باخبر تھے، انہوں نے دونوں کی کمزوریوں پہ تنقید کی، اور مسلمان قوم کو ان کے نقصانات اور برے اثرات سے بروقت آگاہ کیا۔

دونوں طرح کے معاصر تعلیمی نظاموں کا ایک بڑا مسئلہ یہ ہے کہ انہوں نے انسان اور اس کی نفسیات کو غلط فہمی کی بنیاد پر سمجھا ہے۔ یہ نظام اس انسان کے لیے ڈیزائن نہیں کیے گئے جو خالق نے مخصوص مقاصد کے تحت پیدا کیا ہے۔ انسانی فطرت، انسانی تخلیق کا مقصد اور انسان کی اصل صلاحیتیں ان نظاموں میں نظر انداز کر دی گئی ہیں۔ قرآنِ کریم میں انسان کی فطرت اور اس کے بنیادی مقاصد کی وضاحت کی گئی ہے، جیسے کہ سورہ روم (30) اور سورہ احزاب (72) میں انسان کی حقیقی فطرت اور اس کی صلاحیتوں کی جانب اشارہ کیا گیا ہے۔ مزید برآں، خالق کی جانب سے انسان میں پہلے سے پروگرام شدہ صلاحیتیں اور رہنمائی بھی موجود ہیں، جیسا کہ سورہ الاعراف (172-173) میں بیان کیا گیا ہے۔ یعنی انسان اپنی تخلیق کے وقت ہی خالق کی طرف سے خاص سمت اور شعور کے ساتھ پیدا ہوا ہے، جسے موجودہ تعلیمی نظام یا نصاب نے اکثر نظر انداز کر دیا ہے۔ نتیجتاً، یہ نظام انسانی تخلیقی صلاحیتوں، فکری آزادی اور اخلاقی تربیت کو فروغ دینے میں ناکام ہیں، اور انسان کو اپنی اصل شناخت، روحانی استعداد اور مقصودِ تخلیق سے دور لے جاتے ہیں۔ [5]

قدیم دینی مدارس اور ان کا طریقہ ہائے تعلیم:

انیسویں صدی کے اواخر میں برصغیر کا تعلیمی منظر نامہ نو آبادیاتی مداخلت، مسلم سیاسی اقتدار کے زوال، اور روایتی اسلامی اداروں کی بتدریج تقسیم و انحطاط کے زیرِ اثر ایک پیچیدہ صورت اختیار کر چکا تھا۔ مذہبی تعلیمی نظام—خصوصاً مدارس کی روایت—اپنے سابقہ مغلیہ سرپرستی یافتہ کردار سے ہٹ کر ایک دفاعی اور تحفظاتی نوعیت اختیار کر چکا تھا۔

اقبال کے زمانے تک ہندوستان کے اکثر مدارس میں درسِ نظامی کا نصاب رائج تھا، جسے اٹھارویں صدی میں مولانا نظام الدین سہالوی (فرنگی محل) نے مرتب کیا تھا[6]۔ اگرچہ اس نصاب میں ابتدائی طور پر معقولات، منطق، فلسفہ اور دیگر عقلی علوم شامل تھے، تاہم انیسویں صدی کے آخر تک بعض مدارس میں اس کی ساخت میں تبدیلی آچکی تھی۔ اس کے نتیجے میں نصاب کا جھکاؤ زیادہ تر نصوصی تعلیمات (مثلاً فقہ، حدیث، اور حفظِ قرآن) کی طرف ہو گیا، جس کے باعث تخلیقی فکر، فلسفیانہ مکالمہ اور سائنسی تجسس کی حوصلہ افزائی کم ہو گئی ۔[7] یہ مدارس، ریاستی نظام سے ہٹ کر غیر سرکاری اور مقامی کمیونٹی کی بنیاد پر قائم ادارے تھے، جن کا مقصد اسلامی شناخت کا تحفظ، دینی کارپردازوں (امام، مفتی، معلم) کی تیاری، اور روحانی تسلسل کو برقرار رکھنا تھا—بالخصوص ایسے وقت میں جب برطانوی نو آبادیاتی نظام، تعلیم کو مغربی اور سیکولر خطوط پر استوار کر رہا تھا۔

پاکستان کے قیام (1947) کے بعد سے مدارس کی تعداد، رسائی اور اثر و رسوخ میں نمایاں اضافہ ہوا ہے۔ تاہم، پاکستان کے سماجی و مذہبی منظر نامے میں ان کا کردار مزید پیچیدہ ہوتا چلا گیا ہے—یہ ایک طرف مفت تعلیم اور معاشرتی ترقی کا ذریعہ بنے ہیں، اور دوسری طرف مختلف اسلامی تحریکوں کے نظریاتی مراکز کا کردار بھی ادا کر رہے ہیں۔ آج کے مدارس دوہرا کردار نبھا رہے ہیں: یہ غریب اور محروم طبقات کے لیے کم لاگت اور بآسانی دستیاب دینی تعلیم فراہم کرتے ہیں، اور ساتھ ہی بعض صورتوں میں مختلف مذہبی نظریات کی ترویج کا ذریعہ بھی بنتے ہیں۔ اگرچہ بعض مدارس کو فرقہ واریت اور انتہا پسندی سے جوڑا گیا ہے، لیکن ایسے بیانیے اکثر ایک متنوع اور باریک بین ادارے کو عمومی اور سطحی انداز میں پیش کرتے ہیں۔[8][9]

مدارس کے ساتھ ساتھ، گزشتہ دہائیوں میں پاکستان کے شہری علاقوں میں اسلامی اسکولز (جنہیں بعض اوقات 'انگلش میڈیم مدارس' بھی کہا جاتا ہے) کا رجحان تیزی سے بڑھا ہے۔ یہ ادارے جدید مضامین (جیسے سائنس، بزنس، آئی ٹی) کو دینی تعلیم کے ساتھ مربوط کرتے ہیں، اور بعض اوقات O/A لیولز کے ساتھ ساتھ حفظ یا عالم کورسز بھی فراہم کرتے ہیں۔ یہ ادارے ایک ابھرتے ہوئے "اسلامی جدیدیت پسند ماڈل" کی نمائندگی کرتے ہیں، جو خاص طور پر اُن شہری، تعلیم یافتہ خاندانوں کو متوجہ کرتے ہیں جو دین و دنیا کے امتزاج پر مبنی ایک مربوط فکری نقطۂ نظر کے خواہاں ہوتے ہیں۔[10]

اقبال ان مدارس کے روحانی اور ثقافتی کردار کے معترف تھے، لیکن ان کی فکری جمود، غیر تخلیقی ماحول، اور محض تقلیدی تدریسی طریقوں پر سخت تنقید کرتے تھے۔ آپ اسلاف کے علوم و کمالات سے واقف تھے، اور ان کی خودداری اور حمیت کے معترف تھے، جس کو انھوں نے اس طرح بیان فرمایا ہے:

تجھے اس قوم نے پالا ہے آغوشِ محبّت میں — کَچل ڈالا تھا جس نے پاؤں میں تاجِ سرِ دارا
تمدّن آفریں، خلّاقِ آئینِ جہاں داری — وہ صحرائے عرب یعنی شتربانوں کا گہوارا

گدائی میں بھی وہ اللہ والے تھے غیور اتنے — کہ مُنعم کو گدا کے ڈر سے بخشش کا نہ تھا یارا [11]

دینی تعلیم کے لئے دینی مدارس میں قرآن و سنت اور اس سے متعلق علوم کی تدریس کی جاتی ہے۔ ہمارے اسلامی ورثہ اور اسلاف کے علوم کو عصر حاضر تک منتقل کرنے میں ان کا بڑا کردار ہے، لیکن ان میں بعض لوگ اسی صدق و اخلاص پہ قائم نہ رہ سکے اور صراط مستقیم سے ہٹ گئے، جس کے حوالے سے علامہ محمد اقبال رحمت اللہ علیہ اپنی ایک نظم میں فرماتے ہیں کہ:

مَیں بھی حاضر تھا وہاں، ضبطِ سخن کر نہ سکا — حق سے جب حضرتِ مُلّا کو مِلا حکمِ بہشت
عرض کی مَیں نے، الٰہی! مری تقصیر معاف — خوش نہ آئیں گے اسے حُور و شراب و لبِ کشت
نہیں فردوس مقامِ جَدل و قال و اقول — بحث و تکرار اس اللہ کے بندے کی سرشت
ہے بد آموزیِ اقوام و مِلل کام اس کا — اور جنّت میں نہ مسجد، نہ کلیسا، نہ کُنِشت! [12]

علامہ کے بقول اب ان لوگوں میں جنگ و جدال کی عادت پیدا ہو چکی ہے، ہر وقت بحث و تکرار کرنا ان کی طبیعت کا حصہ بنا ہوا ہے۔ اور قوم و ملت کو گمراہ کرنا، غلط راستے پہ ڈالنا ان کا وطیرہ بن چکا ہے۔ علامہ فرماتے ہیں کہ ہمارے موجودہ ائمہ و مشائخ کی اکثریت ایسی ہے جن میں قوم و ملت کی رہنمائی کی صلاحیت نہیں ہے، مزید فرماتے ہیں:

قوم کیا چیز ہے، قوموں کی امامت کیا ہے — اس کو کیا سمجھیں یہ بیچارے دو رکعت کے امام! [13]

اقبال کی دینی مدارس کو اصلاح کی طرف دعوت:

مروجہ تصور کے برخلاف کہ مدارس صرف جامد روایات کے محافظ ہیں، برصغیر پاک وہند کے مدارس نے جدیدیت سے مکمل انکار نہیں کیا بلکہ اپنے دینی تشخص کو برقرار رکھتے ہوئے داخلی سطح پر اصلاحات کی کوششیں کی ہیں ۔[14] یہ مسلسل فکری مکالمہ علامہ اقبال کے اُس نظریے سے ہم آہنگ ہے جس میں وہ وحی اور عقل کے امتزاج پر زور دیتے ہیں—تاہم، اقبال ان محض سطحی تبدیلیوں، جو کہ روحانی بیداری اور تخلیقی فکر کے ساتھ نہ ہوں، کے ناقد تھے۔

علامہ نے دینی حضرات کو ان کے فرائض اور ذمہ داریاں یاد دلانے کی کوشش کی ہیں، صحیح تعلیم وتربیت اور نوجوانوں کی اصلاح کی طرف توجہ دلائی ہے، تاکہ ان میں محنت وکوشش کا ولولہ ولگن پیدا ہو جائے، ان کی موجودہ زبوں حالی اور زوال سے نکالنے کی اور ترقی کے راستے پہ گامزن ہونے کے طریقے ان کو سمجھایئے، بقول علامہ:

اے پیرِ حرم! رسم و رہِ خانقہی چھوڑ — مقصود سمجھ میری نوائے سَحَری کا
اللہ رکھے تیرے جوانوں کو سلامت! — دے ان کو سبق خود شکنی، خود نگَری کا
تُو ان کو سِکھا خارا شگافی کے طریقے — مغرب نے سِکھایا انھیں فن شیشہ گری کا
دِل توڑ گئی ان کا دو صدیوں کی غلامی — دارُو کوئی سوچ ان کی پریشاں نظری کا [15]

جدید تعلیم کے اثرات ونتائج:

قدیم تعلیم کی خامیاں اور ان کی اصلاح کا ذکر کرنے کے علاوہ علامہ فرماتے ہیں کہ جدید تعلیم کے فروغ کے ساتھ ساتھ الحاد اور بے دینی بھی پھیلتی جارہی ہے۔ اپنی ایک نظم بعنوان: تعلیم اور اس کے نتائج، جس میں علامہ نے جدید تعلیم اور اس کے نتائج، میں فرماتے ہیں:

خوش تو ہیں ہم بھی جوانوں کی ترقّی سے مگر — لبِ خنداں سے نکل جاتی ہے فریاد بھی ساتھ
ہم سمجھتے تھے کہ لائے گی فراغت تعلیم — کیا خبر تھی کہ چلا آئے گا الحاد بھی ساتھ [16]

مزید یہ کہ علامہ نے بڑے واضح الفاظ میں مغربی تعلیمی نظام پہ تبصرہ کیا ہے، فرماتے ہیں:

اور یہ اہلِ کلیسا کا نظامِ تعلیم ایک سازش ہے فقط دین و مُروّت کے خلاف [17]

دین و مذہب سے بیزاری:

مغربی تعلیم مذہب سے بیزاری سکھاتی ہے اسی وجہ سے علامہ نے اس سے بیزاری کا اظہار کیا۔ اس تعلیم کی وجہ سے اعلیٰ اخلاقی اقدار ماند پڑ جاتی ہیں، اور یہ نوجوان نسل کو تن پروری، لاپروائی، راحت پسندی اور فیشن پرستی میں مبتلا کرتی ہے۔ یہ تہذیب عقل پرستی سکھاتی ہے جس سے عقائد متزلزل اور افکار منتشر ہوتے ہیں۔ اس کے علاوہ یہ تہذیب نوجوان نسل میں الحاد اور بے دینی پیدا کرتی ہے، بقول علامہ:

گلا تو گھونٹ دیا اہلِ مدرسہ نے ترا کہاں سے آئے صدا 'لَا اِلٰہَ اِلَّا اللہ' [18]

یہ تعلیم تن آسانی تن پروری اور کاہلی پیدا کرتی ہے، طلبا میں نہ حضرت علی رضی اللہ عنہ جیسی طاقت اور حوصلہ پیدا کرتی ہے اور نہ حضرت سلمان رضی اللہ عنہ جیسی سیر چشمی۔ مزید فرماتے ہیں کہ یہ اعلیٰ صفات آپ کو جدید دور کی چمک دمک میں نہیں ملے گیں، بلکہ یہ اسلامی احکامات پر پختہ کاربند ہونے سے ملتی ہیں؛ جس کے حوالے سے علامہ رقم طراز ہے:

ترے صوفے ہیں افرنگی، ترے قالیں ہیں ایرانی لہُو مجھ کو رُلاتی ہے جوانوں کی تن آسانی
امارت کیا، شکوہِ خسروی بھی ہو تو کیا حاصل نہ زورِ حیدری تجھ میں، نہ استغنائے سلمانی
نہ ڈھُونڈ اس چیز کو تہذیبِ حاضر کی تجلّی میں کہ پایا مَیں نے استغنا میں معراجِ مسلمانی [19]

اقبال کے نزدیک تعلیم و تربیت کے مقاصد کی ترجیحات کچھ اس طرح ہیں کہ

اے طائرِ لاہُوتی! اُس رزق سے موت اچھی جس رزق سے آتی ہو پرواز میں کوتاہی [20]

تعلیم و تربیت کا نظام طلبا کو ہر طرح کی علامی سے چھٹکارا دلانے کے لیے تیار کرنے کے قابل ہونا چاہیے نہ کہ ان کو مزید ذہنی غلام بنا ڈالے:

یورپ کی غلامی پہ رضا مند ہوا تُو — مجھ کو تو گلہ تجھ سے ہے، یورپ سے نہیں ہے! [21]

خواتین کی دین سے دوری اور جذبہ امومیت سے بیگانگی:

جدید مغربی (سیکولر) تعلیمی نظام فرد کی روحانی و اخلاقی بنیادوں کو کمزور کر دیتا ہے۔ اقبال سمجھتے ہیں کہ ایسا علم انسان کو محض فنی مہارت تو دیتا ہے، مگر اس کے نصب العین، اخلاقی شعور اور دینی تشخص کو مجروح کر دیتا ہے۔ اس کا ایک نمایاں اثر وہ عورت کے کردار میں دیکھتے ہیں، جہاں جدید تہذیب کے زیرِ اثر خواتین اپنے فطری اور تہذیبی کردار ــــ یعنی پرورش، تعلیمِ نسل، اخلاقی تربیت اور معاشرتی استحکام ــــ سے دور ہوتی چلی جاتی ہیں، اور ان ذمہ داریوں کو بوجھ یا غیر ضروری سمجھنے لگتی ہیں۔ اقبال کے نزدیک عورت کا یہ کردار کسی کم تری کی علامت نہیں بلکہ قوم کی فکری، اخلاقی اور روحانی بقا کی اساس ہے۔ اسی لیے وہ اس علم پر تنقید کرتے ہیں جو عورت کو اس کے فطری اور تہذیبی تشخص سے بیگانہ کر دے۔ علامہ فرماتے ہیں،

بیگانہ رہے دِیں سے اگر مدرسۂ زن — ہے عشق و محبّت کے لیے علم و ہُنر موت [22]

جدید تعلیم خواتین کو اپنی فطری ذمہ داریوں سے بیزاری سکھا رہی ہے۔ اپنی شاعری میں علامہ اقبال اس تعلیمی نظام پر سخت تنقید کرتے ہیں جو عورت کو دین سے بیگانہ کر دے اور امومت کے ادارے کو کمزور کر دے۔ ان کے نزدیک وہ علم جو عورت سے محبت، شفقت اور اخلاقی ذمہ داری چھین لے، تعمیر کے بجائے تخریب کا باعث بنتا ہے۔ اقبال کے نزدیک تعلیم کی حقیقی قدر محض ذہنی و فکری ترقی میں نہیں بلکہ ایمان کے تحفظ، کردار کی پختگی اور تہذیب کے اخلاقی ڈھانچے کو قائم رکھنے میں مضمر ہے۔ جو تعلیمی نظام ان مقاصد کو نقصان پہنچائے ــــ بالخصوص عورت کے سماجی اور تہذیبی کردار کو کم تر یا غیر اہم بنا دے ــــ وہ بالآخر ثقافتی اور روحانی زوال کا سبب بنتا ہے۔

تہذیبِ فرنگی ہے اگر مرگِ اُمومت — ہے حضرتِ انساں کے لیے اس کا ثمر موت
جس علم کی تاثیر سے زن ہوتی ہے نازن — کہتے ہیں اُسی علم کو اربابِ نظر موت [23]

مزید برآں، علامہ اقبال نے اپنے خطوط میں بھی برصغیر کے بعض سماجی اور ثقافتی رویّوں پر تنقید کی ہے، جہاں عورت کو اس کے جائز حقوق سے محروم رکھا جاتا ہے اور اس کی ذاتی خود مختاری کو محدود کر دیا جاتا ہے۔ اقبال کے نزدیک خودی کی تعمیر محض مردوں کی ذمہ داری نہیں بلکہ مرد اور عورت دونوں پر یکساں طور پر عائد ہوتی ہے، کیونکہ ایک صالح اور باوقار معاشرہ اسی وقت تشکیل پاتا ہے جب دونوں اپنی فکری، اخلاقی اور روحانی صلاحیتوں کو بروئے کار لائیں۔ اس طرح عورت کی شخصیت، اس کی تعلیم اور اس کا کردار نہ صرف خاندان بلکہ پوری قوم کی تشکیل میں بنیادی حیثیت رکھتا ہے۔

آزادیِ افکار اور عقل پرستی:

علامہ اقبال آزادیِ افکار کے اس تصور کے سخت ناقد ہیں جو فکری نظم وضبط، اخلاقی ذمہ داری اور روحانی مرکزیت کے بغیر محض بے لگام آزادی کی صورت اختیار کر لے۔ ان کے نزدیک ایسی آزادی فرد اور قوم دونوں کے لیے فکری انتشار اور اخلاقی انحطاط کا سبب بنتی ہے۔ اقبال واضح کرتے ہیں کہ فکر کی آزادی اسی وقت بامعنی ہوتی ہے جب وہ شعوری تدبر اور فکری پختگی کے ساتھ جڑی ہو، بصورتِ دیگر یہ آزادی انسان کو ارتقا کے بجائے زوال کی طرف لے جاتی ہے۔ اسی نکتے کو وہ یوں بیان کرتے ہیں:

آزادیِ افکار سے ہے اُن کی تباہی — رکھتے نہیں جو فکر و تدبّر کا سلیقہ
ہو فکر اگر خام تو آزادیِ افکار — انسان کو حیوان بنانے کا طریقہ! [24]

یہاں اقبال آزادیِ افکار کو بذاتِ خود رد نہیں کرتے بلکہ اس خام اور غیر تربیت یافتہ فکر پر تنقید کرتے ہیں جو آزادی کو محض قید سے نجات سمجھتی ہے، نہ کہ ذمہ داری کے ساتھ غور و فکر کا عمل۔ ایسی فکر میں آزادی شعور کو بلند کرنے کے بجائے جبلّی خواہشات کو آزاد کر دیتی ہے، جس سے انسانی وقار مجروح ہوتا ہے۔

اسی تناظر میں اقبال آزادیِ افکار کو شیطانی فریب قرار دیتے ہیں، جب یہ فرد کو ہر اخلاقی، فکری اور سماجی بندھن سے آزاد کرنے کا دعویٰ کرے۔ ان کے نزدیک ایسی آزادی قوموں کو مقصد سے محروم اور سمت سے بے نیاز کر دیتی ہے:

اُس قوم میں ہے شوخیِ اندیشہ خطرناک — جس قوم کے افراد ہوں ہر بند سے آزاد

گو فکرِ خدا داد سے روشن ہے زمانہ آزادیِ افکار ہے اِبلیس کی ایجاد [25]

یہاں اقبال یہ نکتہ واضح کرتے ہیں کہ اگرچہ زمانہ ظاہری طور پر فکر و شعور سے لبریز نظر آتا ہے، لیکن حقیقت میں بے مہار آزادی نے فکر کو اس کے اخلاقی و روحانی سرچشمے سے کاٹ دیا ہے، جس کے نتیجے میں انسان اپنی تخلیقی قوت کو خیر کے بجائے فتنہ و انتشار کے لیے استعمال کرنے لگتا ہے۔

مزید آگے بڑھتے ہوئے، اقبال عصرِ جدید کی تیز رفتاری اور عجلت پسندی پر تنقید کرتے ہیں، جس نے فکر کی پختگی اور فکری تسلسل کو شدید نقصان پہنچایا ہے۔ ان کے نزدیک جدید زمانہ ہر شے کو جلدی میں ناپختہ بنا دیتا ہے، حتیٰ کہ فلسفہ بھی سطحی اور بے ربط ہو کر رہ گیا ہے:

پُختہ افکار کہاں ڈھونڈنے جائے کوئی اس زمانے کی ہوا رکھتی ہے ہر چیز کو خام
مَدرسہ عقل کو آزاد تو کرتا ہے مگر چھوڑ جاتا ہے خیالات کو بے ربط و نظام
مُردہ، 'لا دینیِ افکار سے افرنگ میں عشق عقل بے ربطیِ افکار سے مشرق میں غلام! [26]

یہاں اقبال جدید تعلیمی نظام کی اس خامی کی نشاندہی کرتے ہیں جو عقل کو تو آزاد کر دیتا ہے، مگر فکر کو کسی منظم اخلاقی یا فکری نظام سے وابستہ نہیں کرتا۔ نتیجتاً عقل محض تجزیے کا آلہ بن کر رہ جاتی ہے، رہنمائی کا ذریعہ نہیں بنتی۔ اسی فکری عدم توازن کے باعث اقبال مغرب اور مشرق دونوں پر تنقید کرتے ہیں۔ ان کے نزدیک مغرب میں لادینیت نے عشق و محبت کو روحانی مرکز سے محروم کر دیا، جبکہ مشرق میں فکری انتشار نے عقل کو غلام بنا دیا۔ یوں اقبال کے نزدیک دونوں تہذیبیں اپنی اپنی انتہاؤں میں توازن کھو بیٹھی ہیں—ایک میں عقل غالب ہو کر روح کو دبا دیتی ہے، اور دوسری میں فکر کی بے ربطی عقل کو بے اثر بنا دیتی ہے۔ اقبال اس فکری بحران کو محض نظری مسئلہ نہیں سمجھتے بلکہ اسے تعلیمی اداروں کی فکری ذمہ داری سے بھی جوڑتے ہیں۔ وہ افسوس کے ساتھ کہتے ہیں کہ اہلِ مدرسہ کا ضمیر بھی افکار کی اسی افراتفری کا شکار ہو چکا ہے:

پُر ہے افکار سے ان مدرسے والوں کا ضمیر خُوب و ناخُوب کی اس دَور میں ہے کس کو تمیز! [27]

اقبال عقل کی حد بندی واضح کرتے ہوئے یہ نکتہ پیش کرتے ہیں کہ عقل رہنمائی تو فراہم کر سکتی ہے، مگر منزل خود نہیں بن سکتی۔ اگر انسان عقل کو ہی آخری معیار سمجھ لے تو وہ باطنی شعور اور روحانی آگہی سے محروم ہو جاتا ہے:

گزر جا عقل سے آگے کہ یہ نُور　　چراغِ راہ ہے، منزل نہیں ہے[28]

اپنے بیشتر اشعار میں اقبال عقل اور وجدان کے باہمی تعلق کو واضح کرتے ہیں۔ عقل راستہ دکھاتی ہے، مگر باطن کی گہرائیوں میں برپا ہونے والے روحانی اور اخلاقی معرکوں سے بے خبر رہتی ہے۔ لہٰذا، ایک متوازن انسانی شخصیت کے لیے ضروری ہے کہ عقل کو وجدان، ایمان اور اخلاقی شعور کے تابع رکھا جائے، نہ کہ ان کا متبادل بنا دیا جائے۔

خرد سے راہرو روشن بصر ہے　　خرد کیا ہے، چراغِ رہ گزر ہے
دُرونِ خانہ ہنگامے ہیں کیا کیا　　چراغِ رہ گزر کو کیا خبر ہے![29]

استاد اور شاگرد: فکری و تربیتی بحران

علامہ اقبال دورِ جدید کے اس تعلیمی نظام سے بیزاری کا اظہار کرتے ہیں جو مغربی تہذیب کی اندھی تقلید پر مبنی ہے اور جس میں تعلیم کا اصل مقصد ــــ یعنی انسانی شخصیت کی اخلاقی، فکری اور روحانی تشکیل ــــ پس پشت ڈال دیا گیا ہے۔ تاہم اقبال کی تنقید محض نظامِ تعلیم تک محدود نہیں رہتی، بلکہ وہ اس نظام کو چلانے والے اساتذہ کی فکری و عملی نااہلی کو بھی زوال کی ایک بنیادی وجہ قرار دیتے ہیں۔ اقبال کے نزدیک وہ اساتذہ جو خود اپنے تعلیمی نصب العین سے ناواقف ہوں، جن کا علمی معیار سطحی ہو، اور جو فکری طور پر خود گمراہ ہوں، وہ نئی نسل کی رہنمائی کے اہل نہیں ہو سکتے۔ ایسے اساتذہ نہ صرف طلبہ کی صلاحیتوں کو نکھارنے میں ناکام رہتے ہیں بلکہ ان کی فطری بلندیوں کو بھی پست کر دیتے ہیں۔ اسی احساسِ کرب کا اظہار اقبال اس مشہور شعر میں کرتے ہیں:

شکایت ہے مجھے یارب! خداوندانِ مکتب سے　　سبق شاہیں بچوں کو دے رہے ہیں خاکبازی کا[30]

یہاں "شاہین بچوں" سے مراد وہ نوجوان ہیں جن میں بلند پروازی، خود اعتمادی اور قیادت کی فطری صلاحیت موجود ہے، مگر نااہل اساتذہ انہیں بلند مقاصد کے بجائے محض سطحی اور غیر تخلیقی سرگرمیوں تک محدود کر دیتے ہیں۔ اقبال کے نزدیک یہ صرف تدریسی ناکامی نہیں بلکہ ایک قومی سانحہ ہے۔ اسی نکتے کو مزید واضح کرتے ہوئے اقبال کہتے ہیں کہ اگر مقصد واقعی قیمتی اور نادر انسانی صلاحیتوں کی تربیت ہو ــــ جسے وہ "لعلِ بدخشاں" سے تعبیر کرتے ہیں ــــ تو پھر رہنمائی کرنے والا خود گمراہ اور بے سمت نہیں ہونا چاہیے:

مقصد ہو اگر تربیتِ لعلِ بدخشاں　　بے سُود ہے بھٹکے ہُوئے خورشید کا پرتُو

دُنیا ہے روایات کے پھندوں میں گرفتار — کیا مَدرسہ، کیا مدرسے والوں کی تگ و دَو!
کر سکتے تھے جو اپنے زمانے کی امامت — وہ کُہنہ دماغ اپنے زمانے کے ہیں پیرو![31]

یہ شعر اس حقیقت کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ جو خود فکری طور پر راستہ بھول چکا ہو، اس کی روشنی دوسروں کے لیے سود مند نہیں ہو سکتی۔ استاد کا کردار محض معلومات کی ترسیل نہیں بلکہ فکری و اخلاقی قیادت کا ہوتا ہے، اور جب یہی قیادت مفقود ہو تو تعلیم بے روح ہو جاتی ہے۔ اقبال اس زوال کو ایک وسیع تر سماجی مسئلے سے بھی جوڑتے ہیں۔ ان کے نزدیک تعلیمی ادارے اور ان کے منتظمین خود فرسودہ روایات کے جال میں الجھے ہوئے ہیں، جس کے باعث ان کی تمام تر جدوجہد محض رسمی اور بے نتیجہ بن کر رہ جاتی ہے۔ اقبال مدرسے اور اس کے اہل دونوں کو تنقید کا نشانہ بناتے ہیں، کیونکہ جب فکر جمود کا شکار ہو جائے تو ادارہ اور افراد دونوں ترقی کی صلاحیت کھو دیتے ہیں۔ بالآخر اقبال اس حقیقت کی نشان دہی کرتے ہیں کہ جو لوگ اپنے زمانے کی فکری قیادت کر سکتے تھے، وہ خود قدیم ذہنیت کے اسیر بن کر رہ گئے ہیں، اور یوں رہنما بننے کے بجائے زمانے کے پیروکار بن گئے ہیں۔ اس تناظر میں اقبال جدید تعلیم یافتہ طبقے—خصوصاً اساتذہ—پر شدید تنقید کرتے ہیں کہ وہ تخلیقی اور اجتہادی کردار ادا کرنے کے بجائے محض مروجہ افکار کی تقلید پر اکتفا کر رہے ہیں۔ نتیجتاً نہ استاد رہنما رہا، نہ شاگرد صاحبِ بصیرت بن سکا، اور یوں پورا تعلیمی نظام فکری بانجھ پن کا شکار ہو گیا۔

تعلیم کا مقصد صرف حصول معاش

مغربی تہذیب کے زیر اثر تعلیم کا غرض صرف حصول معاش، پیسہ کمانا اور دنیاوی لذتوں تک محدود رہ گیا:

عصرِ حاضر مَلک الموت ہے تیرا، جس نے — قبض کی رُوحِ تری دے کے تجھے فکرِ معاش[32]

جس علم کا حصول فقط روٹی کمانا ہو، وہ علم اہل بصیرت کے ہاں کوئی اہمیت نہیں رکھتا، فرماتے ہیں:

وہ علم نہیں، زہر ہے احرار کے حق میں — جس علم کا حاصل ہے جہاں میں دو کفِ جَو[33]

تقلید مغرب کا وسیلہ

جدید تعلیمی نظام نے نوجوانوں کو دین، اخلاق اور ثقافت سے دور کر دیا ہے۔ اس نے نہ صرف فکری اور روحانی تربیت کو نقصان پہنچایا بلکہ ذہنی اضطراب، بے روزگاری اور زندگی میں غیر یقینی کا احساس بھی بڑھا دیا۔ نتیجتاً نوجوان اپنی ثقافتی جڑوں، طرزِ معاشرت اور تخلیقی صلاحیتوں کو بھول بیٹھتے ہیں اور مغربی تہذیب کی اندھی تقلید پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ اقبال اس حقیقت کو یوں بیان کرتے ہیں:

یہ بُتانِ عصرِ حاضر کہ بنے ہیں مدرَسے میں　　نہ ادائے کافرانہ، نہ تراشِ آزرانہ　　[34]

یہ شعر نوجوانوں کی تقلیدی اور روحانی طور پر خالی زندگی کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ "بتانِ عصرِ حاضر" اس حقیقت کی علامت ہیں کہ وہ اپنے اندر اصل تخلیقی صلاحیت اور خودی کے بجائے صرف رسمی اور غیر ذاتی کردار ادا کر رہے ہیں۔ اس نظام نے نوجوانوں کی فکری خود مختاری کو کمزور کر کے انہیں ذہنی غلامی کی طرف دھکیل دیا ہے۔ اقبال آگے بتاتے ہیں کہ نوجوانوں کا وجود ذاتی نہیں بلکہ مغربی طرز زندگی کی پرچھائی ہے:

ترا وجود سراپا تجلّیِ افرنگ　　کہ تُو وہاں کے عمارت گروں کی ہے تعمیر
مگر یہ پیکرِ خاکی خودی سے ہے خالی　　فقط نیام ہے تُو، زرنگار و بے شمشیر![35]

یہ شعر نوجوانوں میں تخلیقی صلاحیت کی کمی اور ذہنی غلامی کی نشاندہی کرتا ہے۔ جسمانی اور ظاہری ڈھانچہ مغربی معیار کے مطابق بنایا گیا ہے، مگر روح، خودی اور اصل قوت موجود نہیں۔ "نیام" کی تشبیہ واضح کرتی ہے کہ یہ صرف خالی بیرونی روپ ہے، جو بظاہر مکمل نظر آتا ہے لیکن اندر سے بے جان اور بے اثر ہے۔

پوسٹ کولونیل نقطہ نظر سے دیکھا جائے تو اقبال یہاں نو آبادیاتی نظام تعلیم کے اثرات کی طرف اشارہ کر رہے ہیں، جو مقامی ثقافت، تخلیقی صلاحیت اور خود مختاری کو کمزور کر دیتا ہے۔ نوجوانوں میں ایک ذہنی غلامی کا احساس پیدا ہوتا ہے، جہاں وہ خود کو غیر ملکی ماڈلز کے تابع سمجھتے ہیں، اپنی قابلیت اور تخلیقی سوچ پر اعتماد نہیں کرتے، اور زندگی کو محض "نوکری تلاش کرنے والے بھیڑ کے حصے" کی طرح گزار دیتے ہیں۔ یہ نظام انہیں تنقیدی سوچ، اصل ایجاد اور خود انحصاری سے محروم کر دیتا ہے اور صرف رسمی تعلیم، تقلید اور معاشرتی دباؤ کی حدود میں محصور رکھتا ہے۔

عصرِ حاضر کے نظامِ تعلیم: فکری بحران اور اصلاح کی ضرورت

اقبال اپنے دور میں رائج دونوں قسم کے تعلیمی نظاموں ـــ روایتی مدارس اور جدید سکول/کالج ـــ سے مطمئن نہیں تھے، کیونکہ ان کے نزدیک یہ نظام وقت کی ضروریات کو پورا نہیں کر پا رہے تھے اور نوجوانوں کو جدید چیلنجز کا مقابلہ کرنے کے قابل نہیں بنا رہے تھے۔

اُٹھا میں مدرسہ و خانقاہ سے غم ناک　　نہ زندگی، نہ محبّت، نہ معرفت، نہ نگاہ![36]

اقبال نہ صرف مذہبی معلمین (ملا) بلکہ فلسفیوں کے محدود اثرات سے بھی ناخوش تھے، کیونکہ یہ دونوں نوجوانوں میں خودی، تخلیقی صلاحیت اور فکری آزادی کو فروغ دینے میں ناکام تھے۔ تعلیم نوجوانوں کے اندر زندگی، جذبہ اور تخلیقی سوچ کو زندہ نہیں کر پا رہی۔

نہ فلسفی سے، نہ مُلّا سے ہے غرض مجھ کو　　یہ دل کی موت، وہ اندیشہ و نظر کا فساد[37]

اقبال اپنے مشاہدے سے اس حقیقت کو عیاں کرتے ہیں کہ معاشرے کے تمام اہم مراکز لمبے عرصے سے کچھ قابل قدر جوہر تراشنے میں ناکام رہے ہیں۔ نہ صرف رسمی تعلیمی ادارے بلکہ معاشرت کے دیگر روحانی اور ثقافتی مراکز بھی نوجوانوں میں فکری بیداری اور تخلیقی جوش پیدا کرنے میں ناکام ہیں۔ یہاں اقبال مستقبل کے ہنگامے (انقلاب، فکری تحریک یا معاشرتی بیداری) کی ضرورت پر زور دیتے ہیں، مگر موجودہ ادارے خاموش اور غیر فعال ہیں۔

کس کو معلوم ہے ہنگامۂ فردا کا مقام　　مسجد و مکتب و میخانہ ہیں مُدّت سے خموش[38]

زیادہ تر مسلم اکثریتی ممالک نے جدید اسکولی نظام تعلیم کو بغیر گہرے فکری غور و خوض کے اپنا لیا ہے۔ یہ نظام، جو مغرب کی صنعتی اور معاشی ضروریات کو پورا کرنے کے لیے تشکیل دیے گئے تھے، انسانی ترقی کے ہمہ جہت تصور کے بجائے کارکردگی، اطاعت، اور منڈی کی تیاری پر زور دیتے ہیں۔[39][40] اگرچہ ان نظاموں میں اسلامی مضامین شامل کرنے کی کوششیں کی گئی ہیں، لیکن ان کا بنیادی فلسفیانہ ڈھانچہ ابھی تک مغربی مادہ پرستی اور افادیت پسندی پر قائم ہے۔[41]

قابلِ غور بات یہ ہے کہ مدارس اور جدید اسلامی اسکولز، جو بظاہر دینی اقدار پر قائم ہیں، انہوں نے بھی لاشعوری طور پر اسی مغربی تعلیمی ماڈل کو اپنا لیا ہے۔ آج کئی ادارے عمر کے حساب سے درجہ بندی، معیاری امتحانات، سخت گریڈنگ کے نظام، اور مقررہ نصابی اوقات جیسے اصولوں پر عمل پیرا ہیں ـــ جو سب مغربی "فیکٹری ماڈل" کی نشانیاں ہیں۔ ایسے نظام میں انفرادی رفتار، تخلیقی جستجو، اور روحانی تفکر کی گنجائش بہت کم رہ جاتی ہے۔ اس کے برعکس، یہ نظام یکسانیت پر مبنی جانچ کے پیمانے نافذ کرتے ہیں، جہاں تمام طلبہ کو ایک ہی پیمانے پر پرکھا جاتا ہے، بغیر

اس بات کے کہ ہر طالب علم کی فطری صلاحیتیں، رجحانات، اور طرزِ فہم مختلف ہو سکتی ہے۔ اس کے نتیجے میں انفرادیت کو کچل دیا جاتا ہے اور تعلیم خودی کی تعمیر کے بجائے ایک تقلیدی مشق بن کر رہ جاتی ہے۔ چاہے بات مدرسے کی ہو یا جدید اسلامی اسکول کی، جب رٹہ، ظاہری نظم، اور امتحان کی کامیابی ہی کو کامیاب تعلیم سمجھا جائے تو یہ وہی سیکولر خامیاں بن جاتی ہیں جن سے بچنے کے لیے یہ ادارے قائم کیے گئے تھے۔ اس کے برعکس، اسلامی تصورِ تعلیم انسان کو اخلاقی، فکری اور روحانی طور پر باشعور بنانے کا عمل ہے، نہ کہ ایسا کارکن یا مبلغ جو محض سیکھے ہوئے مضامین کو دہراتا رہے۔[42]

اس طرح دیکھا جائے تو موجودہ تعلیمی طریقہ کار اور اقبال کے تعلیمی فلسفہ میں بنیادی تضاد یہ ہے کہ اقبال کے نزدیک تعلیم خودی کی تقویت ہے، جبکہ موجودہ نظام اکثر خودی کو مٹا دیتا ہے۔ اس تضاد کو دور کرنے کے لیے ضروری ہے کہ تعلیمی نصاب، تدریسی طریقے اور تربیتی ماحول ایسے ڈیزائن کیے جائیں جو نوجوان کی خودی، تخلیقی صلاحیت اور فکری آزادی کو فروغ دیں، تاکہ تعلیم ایک فعال، معنوی اور تخلیقی تجربہ بن سکے۔ جدید تعلیمی نظریات بھی اس بات کی تصدیق کرتے ہیں کہ تعلیم ایک قدرتی عمل ہونا چاہیے جو فرد کی فطرت، دلچسپی اور تخلیقی صلاحیتوں کو مدنظر رکھے۔ ڈاکٹر رفیع الدین[43] اور کین رابرنسن[44] کے مطابق سیکھنا اور ترقی ایک فطری اور قدرتی عمل ہیں، جس میں طلبہ کی ذاتی دلچسپی، استعداد اور خود انحصاری کو مرکزی حیثیت دی جانی چاہیے۔ یہی نظریہ اقبال کے فلسفہ خودی کے ساتھ ہم آہنگ ہے، کیونکہ دونوں تعلیم کو صرف معلومات کے ذخیرے تک محدود نہیں دیکھتے بلکہ فرد کی مکمل شخصیت کی ترقی کا ذریعہ مانتے ہیں۔

اس خلا کو دور کرنے کے لیے مسلم ماہرینِ تعلیم کو چاہیے کہ وہ اپنے نظامِ تعلیم کی بنیادوں کو از سرِ نو تصور کریں—اور بیرونی ماڈلز کی جگہ وحی پر مبنی، داخلی فلسفے کو اپنائیں۔ اس سلسلے میں علامہ محمد اقبال کی فکری بصیرت راہنمائی فراہم کرتی ہے۔ اقبال، جو اسلامی اور مغربی فکری روایات دونوں میں مہارت رکھتے تھے، انہوں نے اُمتِ مسلمہ کے تعلیمی بحران کو محض نصابی ناکامی نہیں بلکہ فکری گمراہی قرار دیا۔ ان کے نزدیک تعلیم کا اصل مقصد خودی کی تعمیر اور الٰہی مقصد سے ہم آہنگی ہے، جس کے ذریعے روحانی خود مختاری، تخلیقی سوچ اور اخلاقی قوت پیدا ہو۔[45] ان کے تصورِ تعلیم کی بنیاد قرآن کے بیان کردہ خلافتِ ارضی کے نظریے پر ہے، جس میں انسان کو زمین پر اللہ کا ذمہ دار نمائندہ قرار دیا گیا ہے۔[46] اس لیے تعلیم کو اس بلند مقصد کی روشنی میں ڈھالنا چاہیے، نہ کہ ایسے افراد پیدا کیے جائیں جو غیر ملکی نظریات کے محض تابع ہوں۔

علاوہ ازیں، جیسا کہ معروف اسلامی مفکرین جیسے الاطاس،[47] فضل الرحمٰن،[48] اور توحیدی[49] نے بھی واضح کیا ہے، اسلام علم کو دینی و دنیاوی خانوں میں تقسیم نہیں کرتا۔ جو بھی علم شریعت کے دائرے میں ہو اور انسانی بھلائی کا ذریعہ ہو، وہ اسلامی علم کے زمرے میں آتا ہے۔ چنانچہ اصل مقصد صرف موجودہ تعلیمی نظام کو "اسلامی رنگ" دینا نہیں، بلکہ اسلامی وجودیاتی، معرفتی اور تعلیمی اصولوں پر نئے سرے سے مکمل نظام کی تشکیل ہے، جو اسلام کی کلاسیکی روحِ تحقیق، مقصدیت اور ہم آہنگی کو زندہ کر سکے۔

اقبال کا تصورِ تعلیم: دوئی سے ماورا ایک اسلامی تعلیمی فلسفہ

علامہ محمد اقبال نے ایک ایسے تعلیمی ماڈل کا تصور پیش کیا جو روایتی مدرسہ تعلیم اور مغربی سیکولر اسکولنگ کی دوئی سے بلند تر ہو۔ وہ نہ تو جامد اور رسم پر مبنی مذہبی اداروں کے نظام کو مثالی سمجھتے تھے، اور نہ ہی جدید سیکولر تعلیم کی مادّہ پرستانہ بنیادوں کو قبول کرتے تھے۔ اس کے برعکس، اقبال نے ایک ایسے انقلابی فلسفۂ تعلیم کی ضرورت پر زور دیا جو خالصتاً قرآنی تصورِ کائنات پر مبنی ہو—ایسا فلسفہ جو فرد کی اخلاقی، روحانی، فکری اور تخلیقی نشوونما کو فروغ دے، اور جس کی بنیاد اقبال کے نزدیک "خودی" کے تصور پر استوار ہو۔

تعلیم اور فکری زاویہ نظر کا بحران

مسلم دنیا میں رائج بیشتر تعلیمی نظام مغربی سانچوں پر تشکیل دیے گئے ہیں، جن کی فکری بنیادوں کا تنقیدی جائزہ لینے کی زحمت شاذ و نادر ہی کی گئی۔ یہ نظام دراصل نو آبادیاتی یا سرمایہ دارانہ معاشروں کی صنعتی اور معاشی ضروریات پوری کرنے کے لیے وضع کیے گئے تھے، جن کا زور یکسانیت، اطاعت، اور منڈی کی ضروریات کو پورا کرنے پر تھا—نہ کہ فرد کی اندرونی تبدیلی یا روحانی بیداری پر۔ اگرچہ ان نظاموں میں اسلامی مواد شامل کرنے کی کوششیں کی گئی ہیں، لیکن یہ محض سطحی نوعیت کی ہیں کیونکہ ان نظاموں کی بنیادی ساخت اور منطق بدستور سیکولر، مادہ پرستانہ اور افادیت پر مبنی ہے۔ یہی نہیں، بلکہ بہت سی مدارس اور جدید اسلامی اسکول بھی، باوجود اپنے مذہبی مقاصد کے، اسی فرسودہ اور جامد طرز تعلیم کو اپنائے ہوئے ہیں: معیاری نصاب، عمر کی بنیاد پر جماعتی تقسیم، رٹّا سسٹم، اور ایسے امتحانی نظام جو تخلیقی صلاحیت اور انفرادیت کو دباتے ہیں۔[50]

دینی اور عصری دونوں تعلیمی ماحول میں طلبہ کو اکثر علم کے غیر فعال وصول کنندگان کے طور پر دیکھا جاتا ہے، نہ کہ معنی خیز سیکھنے کے سرگرم شریک کے طور پر۔ نتیجتاً ہر طالب علم کی منفرد صلاحیت اور رجحان نظر انداز کر دیے جاتے ہیں، اور تعلیم محض ایک رسمی عمل بن کر رہ جاتی ہے—جو نہ اخلاقی بصیرت جگاتی ہے، نہ تخلیقی سوچ کو پروان چڑھاتی ہے۔ اس طرح طالب علم کو علم کا فعال مفسر بننے کی بجائے ایک معلومات کا کھلونہ بنا دیا جاتا ہے، جہاں ہر طالب علم کی منفرد قوتیں قابو ہوتی ہیں اور تعلیم ایک تقلیدی مشق بن جاتی ہے۔

تعلیم کے تیزاب میں ڈال اس کی خودی کو ہو جائے ملائم تو جدھر چاہے، اسے پھیر [51]

تعلیم میں اسلامی فکری زاویے (تصورِ اسلام) کی مرکزیت

اقبال کے نزدیک تعلیم کا مقصد محض دینی یا سائنسی معلومات کی ترسیل نہیں، بلکہ اسلامی تصورِ حیات (تصورِ اسلامی) کی نشوونما ہے—ایسا فکری زاویہ جو انسان کی حقیقت، اخلاق، اور مقصدِ زندگی کے فہم کو متعین کرتا ہے۔ جب ایک فرد اس تصور کو دل و دماغ میں راسخ کر لیتا ہے، تو پھر وہ کس مضمون کا مطالعہ کر رہا ہے، یہ ثانوی بات بن جاتی ہے؛ اصل اہمیت اس اخلاقی اور روحانی سمت کی ہوتی ہے جو علم کے مقصد اور استعمال کو متعین کرتی ہے۔ اگر ایک مسلمان طالبعلم، خواہ وہ سائنس، تجارت، یا ادب کے میدان میں ہو، اسلامی تصورِ حیات میں راسخ ہو، تو وہ فطری طور پر اپنی معلومات اور پیشہ ورانہ فیصلوں کو الٰہی ہدایات اور جوابدہی کے اصولوں کے مطابق استوار کرنے کی کوشش کرے گا۔ اقبال کے نزدیک انسان کا اصل مقصد شریعت الٰہی کا نفاذ ہے اور تعلیم انسان کو اس مقصدِ کیلئے تیار کرتی ہے، اس مقصد کا حصولِ انسانی زندگی کے ہر شعبے سے تعلق رکھتا ہے جہاں دین و دنیا کا تفرقہ نہیں بلکہ دنیا وہ پلیٹ فارم ہے جہاں اسے شریعت نافذ کرنی ہے۔

اس تناظر میں دین اور دنیا، روح اور مادہ کے درمیان کوئی تقسیم نہیں رہتی۔ اسلام بطور دینِ کامل زندگی کے ہر شعبے—چاہے وہ فنی ہو، علمی ہو یا سماجی—کو اللہ کی بندگی (عبدیت) اور خلافت کے شعور کے ساتھ استعمال کرنے کا تقاضا کرتا ہے۔ لہٰذا تعلیم کا مقصد صرف پیشہ ور ماہرین یا واعظ پیدا کرنا نہیں، بلکہ ایسے افراد کی تربیت کرنا ہے جو اخلاقی بصیرت، روحانی آگہی، اور عملی ذمہ داری کے حامل ہوں۔

اقبال کا بنیادی تعلیمی مقصد: خودی کی پرورش

اقبال کے نزدیک تعلیمی اصلاحات کا مرکزی نکتہ خودی کی بیداری اور استحکام ہے، جسے وہ انسانی انفرادیت اور الٰہی امانت کا جوہر سمجھتے ہیں۔ ان کے خیال میں ایک طاقتور، اخلاقی اصولوں پر قائم اور باخبر فرد کی تشکیل، تمدنی احیاء (civilizational renewal) کی اساس ہے۔ اقبال کے مطابق، خودی کا زوال—چاہے وہ مغرب کی اندھی تقلید کے ذریعے ہو یا جامد روایت پرستی کے نتیجے میں—امتِ مسلمہ کی ذہنی و روحانی پستی کا سبب بنا۔

اقبال تعلیم کو ایسا عمل تصور کرتے ہیں جو فرد کو اخلاقی بصیرت، تخلیقی قوت، اور ذمہ داری کا شعور عطا کرے، تاکہ وہ اللہ تعالیٰ کا خلیفہ بننے کے قابل ہو۔ وہ نہ صرف صوفیانہ فنافی اللہ کی مکمل انفعالیت (passivity) کو مسترد کرتے ہیں بلکہ کارخانہ نما تعلیمی نظام کی ذہنی غلامی اور بے سمتی پر بھی تنقید کرتے ہیں۔ علامہ اقبال کے تعلیمی فلسفے کا بنیادی محور ایک مضبوط فرد کی تعمیر ہے، جو اپنی زندگی میں اپنے اعمال کی پوری ذمہ داری قبول کرے۔ قرآنِ کریم میں بھی اس بات کی تاکید کی گئی ہے کہ "کوئی جان دوسرے کی گناہ کا بوجھ نہیں اٹھائے گی" (سورہ الانعام:164) [52]، جو انسانی فطرت میں ذاتی ذمہ داری اور خود انحصاری کی اہمیت کو ظاہر کرتی ہے۔ اقبال کے نزدیک تعلیم کا مقصد یہی ہے کہ نوجوان اپنی خودی کو پہچانیں، اپنی صلاحیتوں اور امکانات کے مطابق فیصلے کریں، اور زندگی کے ہر پہلو میں فعال اور بااختیار کردار ادا کریں۔ مثالی

فرد وہ ہے جو آزادی، خود اختیاری، اور الٰہی مقصد کا حامل ہو—ایسا روشن موتی جو وجود کے سمندر میں اپنی منفرد چمک اور پہچان کے ساتھ نمایاں ہو، نہ کہ ایک ایسا قطرہ جو ہجوم میں کھو جائے۔

آزادی، تخلیقیت، اور تعلیمی ماڈل کی اصلاح کی ضرورت

اقبال کے نزدیک حقیقی تعلیمی نشوونما صرف اسی ماحول میں ممکن ہے جہاں فکری آزادی میسر ہو—ایسی آزادی جو نہ تو مغرب کی اندھی عقیدت کی اسیر ہو، اور نہ ہی روایتی نصاب کی سخت گیر ساخت کی پابند ہو۔ وہ ایک ایسے تعلیمی نظام کے خواہاں تھے جو طالبعلموں کو تنقیدی سوچنے، آزادانہ تجربات کرنے اور اپنے منفرد انداز میں سیکھنے اور اظہار کرنے کی مکمل آزادی دے۔ اس کے برعکس، اقبال نے انتباہ دیا کہ موجودہ تعلیمی نظام—چاہے وہ اسکول ہوں یا دینی مدارس—اتنے سخت گیر اور جامد ہو چکے ہیں کہ وہ بچوں کی فطری تجسس، تخلیقیت، اور فکری جستجو کو دبا دیتے ہیں۔ اپنی شعری فکر کے ذریعے اقبال نے واضح کیا کہ:

"اگر علم چاہتے ہو تو شک کو بڑھاؤ، یقین کو گھٹاؤ؛ اور اگر عمل چاہتے ہو تو شک کو چھوڑو، یقین اختیار کرو۔"[53]

اقبال کے مطابق، تشکیک تحقیق کی کنجی ہے، جو انسان کو سوالات اُٹھانے، فرضیات کو جانچنے، اور گہرائی سے سوچنے پر اُبھارتا ہے۔ تعلیم کا مقصد یہ ہونا چاہیے کہ یہ سوچ اور عمل کا طوفان برپا کرے، نہ کہ طلباء کو صرف رٹنے اور اطاعت پر مجبور کرے۔

فرد اور ملت: ایک ہم آہنگ تعلق

اقبال کا تصورِ تعلیم محض انفرادی خود مختاری کی ترویج نہیں کرتا، بلکہ وہ فرد اور اُمت کے درمیان ایک متحرک اور بامقصد تعلق کا تصور پیش کرتے ہیں۔ ان کے نزدیک ہر فرد مسلم اُمت کی اجتماعی اخلاقی، فکری اور روحانی زندگی کا لازمی جزو ہے۔ اقبال اس تعلق کو مؤثر انداز میں واضح کرنے کے لیے قیمتی موتیوں کی لڑی یا دریا کی لہروں کی مثال دیتے ہیں—جہاں فرد کی انفرادیت مٹتی نہیں بلکہ ایک بلند تر نصب العین کے ساتھ ہم آہنگ ہو جاتی ہے۔ مسلمانوں کے لیے یہ نصب العین اللہ تعالیٰ کے زمین پر خلیفہ ہونے کی ذمہ داری کو نبھانا ہے۔

یہ فکری خاکہ اقبال کے فارسی مجموعہ ہائے کلام میں نہایت خوبی سے بیان ہوا ہے۔ اسرارِ خودی میں وہ فرد کی خودی کی تعمیر پر زور دیتے ہیں—جو انسانی وقار، خود اختیاری، اور صلاحیت کا سرچشمہ ہے۔ جبکہ رموزِ بے خودی میں وہ اس بات کی وضاحت کرتے ہیں کہ جب ایک فرد اپنی خودی کو بیدار کر لیتا ہے تو وہ اپنی توانائی، بصیرت اور اخلاقی عزم کو اُمت کی خدمت میں پیش کرتا ہے۔ اقبال کے نزدیک ایک قوم کی حقیقی قوت اُن افراد میں مضمر ہے جو اپنی انفرادیت کو برقرار رکھتے ہوئے اجتماعی دینی مقاصد کے لیے خود کو رضاکارانہ طور پر وقف کرتے ہیں۔

تاہم، فرد جب تک اپنی داخلی تعمیر نہیں کرتا، وہ ملت کے لیے کوئی مؤثر کردار ادا نہیں کر سکتا۔ جیسا کہ کہا جاتا ہے: "خالی پیالے سے کچھ نہیں انڈیلا جا سکتا"۔ یہی حقیقت اقبال کے تصور میں بھی نمایاں ہے کہ اُمت کی زندگی میں بامعنی شمولیت کے لیے فرد میں باطنی استحکام، مقصد کی وضاحت، اور اخلاقی خود مختاری ضروری ہے۔ صرف وہی فرد جو روحانی و فکری لحاظ سے تیار ہو، ملت کے اجتماعی مشن کو آگے بڑھانے میں مؤثر کردار ادا کر سکتا ہے—اور اُسے اللہ کے دین کے علمبردار اور انصاف و دانش کے رہنما کی حیثیت سے دنیا میں اُبھار سکتا ہے۔

یہی وہ حتمی مقصد ہے جسے تعلیم کو حاصل کرنا چاہیے: محض معلومات کی ترسیل نہیں، بلکہ ایسے افراد کی تربیت جو نہ صرف خود کو بلکہ اپنی پوری سوسائٹی کو اللہ کی رضا کے لیے بدلنے کی صلاحیت رکھتے ہوں۔

قومی شناخت، ورثہ اور تہذیبی تسلسل

اقبال کے نزدیک کوئی قوم اُس وقت تک اپنے مستقبل کی تعمیر نہیں کر سکتی جب تک کہ وہ اپنی تاریخی شناخت اور روایات سے گہری وابستگی نہ رکھے۔ اسلامی تہذیب نے اپنی مخصوص فکری اور ثقافتی شناخت کو برقرار رکھتے ہوئے نہ صرف روم اور ایران جیسے عظیم الشان سلطنتوں کو چیلنج کیا بلکہ انہیں کئی پہلوؤں میں پیچھے چھوڑ دیا۔ اقبال کے نزدیک تعلیم کے ذریعے اس تہذیبی ورثے کی حفاظت اور ترسیل نہایت ضروری ہے تاکہ ایک مضبوط قومی خودی اور اجتماعی شعور کی تشکیل ہو سکے۔ چنانچہ تعلیم میں محض مذہبی متون ہی شامل نہ ہوں، بلکہ اسلامی تہذیب کے سائنسی، فنی، اور فلسفیانہ خدمات و علوم کو بھی اجاگر کیا جانا چاہیے۔

خودی کی خدمت میں سائنس اور فنون کا کردار

اقبال سائنس اور فنونِ لطیفہ کو خود اپنے لیے مقصد نہیں سمجھتے، بلکہ وہ انہیں انسانی خودی کو وسعت دینے اور خدائی نظام کو سمجھنے کے ذرائع کے طور پر دیکھتے ہیں۔ سائنسی علوم انسان کو کائنات میں اللہ کی آیات کے مشاہدے اور دریافت میں مدد دیتے ہیں، اور اسے اس قابل بناتے ہیں کہ وہ خلافتِ ارضی کی اپنی ذمہ داری کو بہتر طور پر نبھا سکے۔ اقبال کے نزدیک ہر علم—خواہ وہ حیاتیات ہو، طبیعیات، ادب ہو یا فنِ تعمیر—بالآخر انسان کی خودی کی تربیت اور بنی نوع انسان کی خدمت کا ذریعہ ہونا چاہیے۔ وہ تحقیق کے جذبے اور تکنیکی ترقی کو سراہتے ہیں، لیکن اس بات پر زور دیتے ہیں کہ ہر علم کو وحی کے اخلاقی اصولوں کے تابع ہونا چاہیے۔ اقبال کی نظر میں سائنس اور مذہب ایک دوسرے کے متضاد نہیں، بلکہ یہ دو ہم آہنگ راستے ہیں جو مل کر انسانی زندگی کے الٰہی مقصد کو روشن کرتے ہیں۔

اقبال کا صنفی بنیادوں پر تعلیم کا نقطۂ نظر

اقبال نے تعلیم کے معاملے میں فطری اور شرعی ذمہ داریوں پر مبنی کرداروں کی اہمیت پر زور دیا۔ اُنہوں نے مغربی تصورِ صنفی مساوات (gender neutrality) کے خلاف خبردار کیا، کیونکہ اُن کے نزدیک یہ نظریہ خاندانی نظام کو کمزور کرتا ہے اور معاشرتی ہم آہنگی کو نقصان پہنچاتا ہے۔ اقبال مسلمان عورتوں کے لیے ایک ایسا تعلیمی ماڈل تجویز کرتے ہیں جو اُن کے انفرادی تشخص، عزت، اور دینی شناخت کے تحفظ کے ساتھ ساتھ اُن کی گھریلو اور معاشرتی ذمہ داریوں کی ادائیگی کے لیے بھی انہیں تیار کرے۔ ان کے نزدیک عورت کا کردار کسی مغربی ماڈل کی تقلید میں نہیں، بلکہ اس کی فطرت، قرآن و سنت کی روشنی، اور امت کی فلاح میں مضمر ہے۔

علم کا حتمی معیار

اقبال کے نزدیک علم کی تخلیق اور اس کے اطلاق کے لیے شریعت کی حدود اور اصولی رہنمائی کو اخلاقی بنیاد بنانا لازم ہے۔ وہ اس بات پر متنبہ کرتے ہیں کہ اگر علم کا تعلق وحی سے منقطع ہو جائے تو سائنس اور سیاست جیسی قوتیں بھی انسانیت کے لیے تباہ کن بن سکتی ہیں، جیسا کہ مادی فکر پر مبنی سلطنتوں کے مظالم سے ظاہر ہے۔ اقبال قرآن کو صرف عبادات اور اخلاقیات کی رہنمائی کا ذریعہ نہیں سمجھتے، بلکہ وہ اسے ایک ہمہ گیر اور مربوط نظامِ فکر کی بنیاد تصور کرتے ہیں، جو انسان کی انفرادی اور اجتماعی زندگی کو سلیقے سے ترتیب دیتا ہے۔

اقبال کے تصورِ تعلیم کا تنقیدی جائزہ

علامہ اقبال کا تعلیمی فلسفہ اس لحاظ سے منفرد ہے کہ وہ روایتی مذہبی تعلیم اور جدید سیکولر تعلیم دونوں پر بیک وقت تنقید کرتے ہیں، اور ایک ایسا امتزاجی ماڈل پیش کرتے ہیں جو دین و دنیا، روح و مادہ، عقل و عشق کے درمیان تفریق کو ختم کرتا ہے۔ ان کا بنیادی مقصد نوجوان کی "خودی" کی تعمیر ہے، جو فرد کو بے مقصدیت، تقلید اور مادیت سے نکال کر بااختیار، بامقصد اور ذمہ دار شہری بناتی ہے۔ تربیت خودی محض نظریاتی تصور نہیں بلکہ یہ نفسیاتی اور اخلاقی تربیت کا ایک عملی ڈھانچہ بھی فراہم کرتا ہے، جو تخلیقی صلاحیت، فکری آزادی اور تنقیدی سوچ کو فروغ دیتا ہے۔ اقبال تعلیم کو رٹے اور تقلید سے مختلف ایک ذریعے کے طور پر دیکھتے ہیں، اور چاہتے ہیں کہ نوجوان سوال اٹھائیں، سوچیں اور اپنی تخلیقی طاقت کو پہچانیں۔

اقبال اپنے فلسفے میں نوجوانوں کو تاریخی، ثقافتی اور دینی ورثے سے جوڑے رکھنے پر بھی زور دیتے ہیں، تاکہ وہ اپنی شناخت اور قومی تشخص کو محفوظ رکھ سکیں۔ علم کے ساتھ مقصدیت اور اخلاقیات کی بالادستی بھی ان کے فلسفے کا لازمی جزو ہے؛ ان کے نزدیک علم محض روزگار یا ذاتی فائدے کے لیے نہیں بلکہ خلافتِ الٰہی کے تابع ہے، اور یہ تعلیم کو مادہ پرستی اور بے راہ روی سے محفوظ رکھتا ہے۔ تاہم، ان کے فلسفے کا عملی نفاذ ایک چیلنج ہے، کیونکہ وہ نصاب، اساتذہ کی تربیت یا امتحانی نظام کی تفصیلات پر زیادہ وضاحت نہیں دیتے۔ فلسفہ واضح منزل دکھاتا ہے، مگر سفر

کے عملی راستے کم نمایاں ہیں۔ اقبال کے فلسفہ تعلیم کے عملی نفاذ کے لیے تفصیلی تجربی تحقیق(Empirical Research) کی ضرورت ہے جو مشاہدے، تجربے، اور عملی ڈیٹا پر مبنی ہو، تاکہ مسلم دنیا بلخصوص پاکستان کے مخصوص معاشرتی، ثقافتی اور تعلیمی پس منظر کو مد نظر رکھتے ہوئے ایک مؤثر اور عملی تعلیمی نظام تیار کیا جاسکے۔

اگرچہ اقبال کا دور آج کے ڈیجیٹل، گلوبلائزڈ اور پوسٹ ماڈرن معاشرے سے یکسر مختلف تھا، وہ خود ہمیشہ جدید سائنسی ترقیات سے باخبر رہے اور ٹیکنالوجی کو مسلمانوں کے لیے عبادت اور ترقی کا ذریعہ سمجھتے تھے۔ ان کے نظریات بنیادی اصول فراہم کرتے ہیں، جو آج بھی متعلقہ ہیں اور موجودہ چیلنجز کے مطابق ڈھالے جاسکتے ہیں۔ صنفی نقطہ نظر پر بھی بعض لوگ تنقید کرتے ہیں کہ اقبال نے خواتین کی تعلیم میں گھریلو مرکزیت پر زور دیا، لیکن حقیقت یہ ہے کہ وہ خواتین کی خودی، فکری آزادی اور ایجنسی کی ترقی کی بھی حمایت کرتے تھے، اور ان کا کردار صرف ماں یا گھریلو ذمہ دار تک محدود نہیں۔ اس سلسلے میں انھوں نے جاوید نامہ اور اپنی دیگر فارسی شاعری میں ایسی خواتین کا ذکر خیر کیا جنہوں نے اپنی جرات سے اپنے معاشرے میں تبدیلی لائی۔

اقبال علم کو صرف معاشی ترقی کے لیے محدود نہیں سمجھتے، بلکہ خودی اور ہر پہلو میں خود انحصاری پر زور دیتے ہیں۔ اس کے باوجود، موجودہ دور میں تعلیم اور معاشی ترقی کے ربط کو عملی طور پر مزید واضح کرنے کی ضرورت ہے۔ مجموعی طور پر، علامہ اقبال کا تعلیمی فلسفہ ایک روشن چراغ کی مانند ہے جو منزل تو دکھاتا ہے، مگر راستے کی تمام رکاوٹوں کو روشن نہیں کرتا۔ اس کی اصل طاقت بلند مقاصد، رہنما اصولوں اور توازن پر اصرار میں ہے، اور آج کی ضرورت یہ ہے کہ ان اصولوں کو جدید نفسیات، تعلیمی ٹیکنالوجی اور معاشی تقاضوں کے مطابق ڈھالا جائے تاکہ ایک عملی اور مؤثر نظامِ تعلیم وجود میں آسکے جو اقبال کے خواب کو حقیقت کا روپ دے۔

تعلیمی نشاۃِ ثانیہ کی ضرورت

اقبال کا تعلیمی فلسفہ محض نصاب کی تبدیلی کی بات نہیں کرتا، بلکہ وہ تعلیم کے تصور، مقصد، اور طریقۂ کار کی مکمل اصلاح کا داعی ہے۔ ان کے نزدیک تعلیم ایک مقدس عمل ہے، جس کا مقصد ہر انسان میں ودیعت شدہ ربانی استعداد کو بیدار کرنا ہے۔ یہ بیداری آزادی، اخلاقی عزم، اور تخلیقی تجربے کے ذریعے "خودی" کی پرورش کرتی ہے۔ صرف اسی نوعیت کی تعلیم ایسے افراد تیار کرسکتی ہے جو اللہ کے شعوری بندے اور زمین پر اس کے ذمے دار نائب بن کر زندگی گزاریں۔ یہی تعلیم ملتِ اسلامیہ کو پھر سے علم، انصاف، اور روحانی قیادت کی روشنی کا مینار بنا سکتی ہے۔

حوالہ جات

[1]Nauman, Sarwat: "Iqbal-education and cultivation of self: a way forward for Muslims of the subcontinent," Educational Philosophy and Theory, Volume 50, Number 4, 2018, pp. 326-337.

[2] Maududi, Syed Abul Ala: The Education, (Translated by S. M. Rauf), (New Delhi: Markazi Maktaba Islami, 2000).

[3] Qutb, Sayyid: Milestones, (Translated by S. Badr), (Indianapolis: American Trust Publications, 1984).

[4]Iqbal, Muhammad: The Reconstruction of Religious Thought in Islam, (Stanford: Stanford University Press, 2002). (Original work published 1930).

[5] فَأَقِمْ وَجْهَكَ لِلدِّينِ حَنِيفًا ۚ فِطْرَتَ ٱللَّهِ ٱلَّتِي فَطَرَ ٱلنَّاسَ عَلَيْهَا ۚ لَا تَبْدِيلَ لِخَلْقِ ٱللَّهِ ۚ ذَٰلِكَ ٱلدِّينُ ٱلْقَيِّمُ وَلَٰكِنَّ أَكْثَرَ ٱلنَّاسِ لَا يَعْلَمُونَ [الروم: 30]

سمحإِنَّا عَرَضْنَا ٱلْأَمَانَةَ عَلَى ٱلسَّمَٰوَٰتِ وَٱلْأَرْضِ وَٱلْجِبَالِ فَأَبَيْنَ أَن يَحْمِلْنَهَا وَأَشْفَقْنَ مِنْهَا وَحَمَلَهَا ٱلْإِنسَٰنُ ۖ إِنَّهُۥ كَانَ ظَلُومًا جَهُولًاسجى [الأحزاب: 72]

سمحوَإِذْ أَخَذَ رَبُّكَ مِنۢ بَنِىٓ ءَادَمَ مِن ظُهُورِهِمْ ذُرِّيَّتَهُمْ وَأَشْهَدَهُمْ عَلَىٰٓ أَنفُسِهِمْ أَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ ۖ قَالُوا۟ بَلَىٰ شَهِدْنَآ ۛ أَن تَقُولُوا۟ يَوْمَ ٱلْقِيَٰمَةِ إِنَّا كُنَّا عَنْ هَٰذَا غَٰفِلِينَ ۔ أَوْ تَقُولُوٓا۟ إِنَّمَآ أَشْرَكَ ءَابَآؤُنَا مِن قَبْلُ وَكُنَّا ذُرِّيَّةً مِّنۢ بَعْدِهِمْ ۖ أَفَتُهْلِكُنَا بِمَا فَعَلَ ٱلْمُبْطِلُونَ سجى [الأعراف: 172-173]

[6] Robinson, Francis: The Ulama of Farangi Mahall and Islamic Culture in South Asia, (Delhi: Permanent Black, 2001).

[7] Metcalf, Barbara D.: Islamic Revival in British India: Deoband, 1860-1900, (Princeton: Princeton University Press, 2014).

[8] Fair, C. Christine: The madrassah challenge: Militancy and religious education in Pakistan, (Washington, DC: United States Institute of Peace Press, 2008).

[9] Bano, Masooda: The rational believer: Choices and decisions in the madrasas of Pakistan, (Ithaca: Cornell University Press, 2012).

[10] Ali, Muhammad Abid: An analysis of conceptions and practices of Pakistani educators in private Islamic schools in light of Iqbal's educational philosophy, Doctoral dissertation, (Kuala Lumpur: Institute of Education, International Islamic University Malaysia, 2011).

[11] سر محمد اقبال۔ کلیاتِ اقبال: اردو۔ (لاہور: اقبال اکادمی پاکستان، 2021)، ص. ۲۰۷۔

12 اقبال، علامہ محمد: کلیاتِ اقبال اردو، (لاہور: اقبال اکادمی پاکستان، ۲۰۱۸ء)، ص. 515، 516۔

[13] ایضاً، ص. 612۔

[14] Zaman, Muhammad Qasim: "Religious Education and the Rhetoric of Reform: The Madrasa in British India and Pakistan," Comparative Studies in Society and History, Volume 41, Number 2, 1999, pp. 294–323.

[15] اقبال، علامہ محمد: کلیاتِ اقبال اردو، (لاہور: اقبال اکادمی پاکستان، ۲۰۱۸ء)، ص. 656۔

[16] ایضاً، ص. 254۔

[17] ایضاً، ص. 694۔

[18] ایضاً، ص. 381۔

[19] ایضاً، ص. 519۔

[20] ایضاً، ص. 432۔

[21] ایضاً، ص. 779۔

[22] ایضاً، ص. 710۔

[23] ایضاً، ص. 710۔

[24] ایضاً، ص. 680۔

[25] ایضاً، ص. 582۔

[26] ایضاً، ص. 687۔

[27] ایضاً، ص. 687۔

[28] ایضاً، ص. 464۔

[29] ایضاً، ص. 465۔

[30] ایضاً، ص. 403۔

[31] ایضاً، ص. 692۔

[32] ایضاً، ص. ۶۹۰۔

[33] ایضاً، ص. 678۔

[34] ایضاً، ص. 354۔

[35] ایضاً، ص. ۲۲۳۔

[36] ایضاً، ص. 382۔

[37] ایضاً، ص. 446۔

[38] ایضاً، ص. 403۔

[39] Gatto, John T.: Weapons of mass instruction: A schoolteacher's journey through the dark world of compulsory schooling, (Gabriola Island: New Society Publishers, 2009).

[40] Robinson, Sir Ken: Bring on the learning revolution!, TED Talks, Retrieved December 15, 2010, from: http://www.ted.com/talks/sir_ken_robinson_bring_on_the_revolution.html

[41] Hashim, Rosnani: "Educational Dualism in Malaysia: Implications for Theory and Practice," The Journal of Asian Studies, Volume 57, 1998.

[42] Ali, Muhammad Abid: An analysis of conceptions and practices of Pakistani educators in private Islamic schools in light of Iqbal's educational philosophy, Doctoral dissertation, (Kuala Lumpur: Institute of Education, International Islamic University Malaysia, 2011).

[43] Rafiuddin, Muhammad: First Principles of Education (Second Edition), (Lahore: Iqbal Academy, 1983).

[44] Robinson, Sir Ken: Bring on the learning revolution!, TED Talks, Retrieved December 15, 2010, from: http://www.ted.com/talks/sir_ken_robinson_bring_on_the_revolution.html

[45] Iqbal, M. (1944). The secrets of the self: (Asrar-i-Khudi) Aphilosophical poem (Revised ed.).Sh. M. Ashraf.

[46] القرآن، البقرہ2: 30۔

[47] Al-Attas, Syed Muhammad Naquib: "Introduction," in Aims and Objectives of Islamic Education, (editors' names if given), (London: Hodder & Stoughton, 1979), pp. 1-15.

[48] Rahman, Fazlur: Islam and modernity: Transformation of an intellectual tradition, (Chicago: University of Chicago Press, 1984).

[49] Tawhidi, Dawud: The tarbiyah project: a holistic vision of Islamic education, (San Diego: Tarbiyah Institute, 2001).

[50] Ali, Muhammad Abid: An analysis of conceptions and practices of Pakistani educators in private Islamic schools in light of Iqbal's educational philosophy, Doctoral dissertation, (Kuala Lumpur: Institute of Education, International Islamic University Malaysia, 2011).

[51] سر محمد اقبال۔ کلیاتِ اقبال: اردو۔ (لاہور: اقبال اکادمی پاکستان، ۲۰۲۱)، ص. ۶۶۶۔

[52] القرآن، الانعام 6: 164۔

[53] Iqbal, Muhammad: Message from the East: A selective verse rendering of Iqbal's Payam-i-Mashriq, (Translated by M. H. Hussain), (Karachi: Iqbal Academy, 1971).

References:

1.Nauman, Sarwat: "Iqbal-education and cultivation of self: a way forward for Muslims of the subcontinent," Educational Philosophy and Theory, Volume 50, Number 4, 2018, pp. 326-337.

2.Maududi, Syed Abul Ala: The Education, (Translated by S. M. Rauf), (New Delhi: Markazi Maktaba Islami, 2000).

3.Qutb, Sayyid: Milestones, (Translated by S. Badr), (Indianapolis: American Trust Publications, 1984).

4.Iqbal, Muhammad: The Reconstruction of Religious Thought in Islam, (Stanford: Stanford University Press, 2002). (Original work published 1930).

5.فَأَقِمْ وَجْهَكَ لِلدِّينِ حَنِيفًا ۚ فِطْرَتَ ٱللَّهِ ٱلَّتِي فَطَرَ ٱلنَّاسَ عَلَيْهَا ۚ لَا تَبْدِيلَ لِخَلْقِ ٱللَّهِ ۚ ذَٰلِكَ ٱلدِّينُ ٱلْقَيِّمُ وَلَٰكِنَّ أَكْثَرَ ٱلنَّاسِ لَا يَعْلَمُونَ [الروم: 30]

سمحإِنَّا عَرَضْنَا ٱلْأَمَانَةَ عَلَى ٱلسَّمَٰوَٰتِ وَٱلْأَرْضِ وَٱلْجِبَالِ فَأَبَيْنَ أَن يَحْمِلْنَهَا وَأَشْفَقْنَ مِنْهَا وَحَمَلَهَا ٱلْإِنسَٰنُ ۖ إِنَّهُۥ كَانَ ظَلُومًا جَهُولًاسجى [الأحزاب: 72]

6.سمحوَإِذْ أَخَذَ رَبُّكَ مِنۢ بَنِىٓ ءَادَمَ مِن ظُهُورِهِمْ ذُرِّيَّتَهُمْ وَأَشْهَدَهُمْ عَلَىٰٓ أَنفُسِهِمْ أَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ ۖ قَالُوا۟ بَلَىٰ شَهِدْنَآ ۛ أَن تَقُولُوا۟ يَوْمَ ٱلْقِيَٰمَةِ إِنَّا كُنَّا عَنْ هَٰذَا غَٰفِلِينَ ۔ أَوْ تَقُولُوٓا۟ إِنَّمَآ أَشْرَكَ ءَابَآؤُنَا مِن قَبْلُ وَكُنَّا ذُرِّيَّةً مِّنۢ بَعْدِهِمْ ۖ أَفَتُهْلِكُنَا بِمَا فَعَلَ ٱلْمُبْطِلُونَ سجى [الأعراف: 172-173]

7.Robinson, Francis: The Ulama of Farangi Mahall and Islamic Culture in South Asia, (Delhi: Permanent Black, 2001).

8.Metcalf, Barbara D.: Islamic Revival in British India: Deoband, 1860-1900, (Princeton: Princeton University Press, 2014).

9.Fair, C. Christine: The madrassah challenge: Militancy and religious education in Pakistan, (Washington, DC: United States Institute of Peace Press, 2008).

10.Bano, Masooda: The rational believer: Choices and decisions in the madrasas of Pakistan, (Ithaca: Cornell University Press, 2012).

11.Ali, Muhammad Abid: An analysis of conceptions and practices of Pakistani educators in private Islamic schools in light of Iqbal's educational philosophy, Doctoral dissertation, (Kuala Lumpur: Institute of Education, International Islamic University Malaysia, 2011).

12.Iqbal Sir Muhammad. Kulliyat-e-Iqbal: Urdu. (Lahore: Iqbal Academy Pakistan, 2021), p. 207.

13.Iqbal Allama Muhammad. Kulliyat-e-Iqbal Urdu. (Lahore: Iqbal Academy Pakistan, 2018), pp. 515, 516.

14.Ibid., p. 612.

15.Zaman, Muhammad Qasim: "Religious Education and the Rhetoric of Reform: The Madrasa in British India and Pakistan," Comparative Studies in Society and History, Volume 41, Number 2, 1999, pp. 294–323.

16.Ibid., p. 254.

17.Ibid., p. 694.

18.Ibid., p. 381.

19.Ibid., p. 519.

20.Ibid., p. 432.

21.Ibid., p. 779.

22.Ibid., p. 710.

23.Ibid., p. 710.

24.Ibid., p. 680.

25.Ibid., p. 582.

26.Ibid., p. 687.

27.Ibid., p. 687.

28.Ibid., p. 464.

29.Ibid., p. 465.

30.Ibid., p. 403.

31.Ibid., p. 692.

32.Ibid., p. 690.

33.Ibid., p. 678.

34.Ibid., p. 354.

35.Ibid., p. 623.

36.Ibid., p. 382.

37.Ibid., p. 446.

38.Ibid., p. 403.

39.Gatto, John T.: Weapons of mass instruction: A schoolteacher's journey through the dark world of compulsory schooling, (Gabriola Island: New Society Publishers, 2009).

40.Robinson, Sir Ken: Bring on the learning revolution!, TED Talks, Retrieved December 15, 2010, from: http://www.ted.com/talks/sir_ken_robinson_bring_on_the_revolution.html

41.Hashim, Rosnani: "Educational Dualism in Malaysia: Implications for Theory and Practice," The Journal of Asian Studies, Volume 57, 1998.

42.Ali, Muhammad Abid: An analysis of conceptions and practices of Pakistani educators in private Islamic schools in light of Iqbal's educational philosophy, Doctoral dissertation, (Kuala Lumpur: Institute of Education, International Islamic University Malaysia, 2011).

43.Rafiuddin, Muhammad: First Principles of Education (Second Edition), (Lahore: Iqbal Academy, 1983).

44.Robinson, Sir Ken: Bring on the learning revolution!, TED Talks, Retrieved December 15, 2010, from: http://www.ted.com/talks/sir_ken_robinson_bring_on_the_revolution.html

45.Iqbal, M. (1944). The secrets of the self: (Asrar-i-Khudi) Aphilosophical poem (Revised ed.).Sh. M. Ashraf.

46.القرآن، البقرہ2: 30۔

47.Al-Attas, Syed Muhammad Naquib: "Introduction," in Aims and Objectives of Islamic Education, (editors' names if given), (London: Hodder & Stoughton, 1979), pp. 1-15.

48.Rahman, Fazlur: Islam and modernity: Transformation of an intellectual tradition, (Chicago: University of Chicago Press, 1984).

49.Tawhidi, Dawud: The tarbiyah project: a holistic vision of Islamic education, (San Diego: Tarbiyah Institute, 2001).

50.Ali, Muhammad Abid: An analysis of conceptions and practices of Pakistani educators in private Islamic schools in light of Iqbal's educational philosophy, Doctoral dissertation, (Kuala Lumpur: Institute of Education, International Islamic University Malaysia, 2011).

51.Iqbal Sir Muhammad. Kulliyat-e-Iqbal: Urdu. (Lahore: Iqbal Academy Pakistan, 2021), p.666